۲۲ راپریل ۱۹۷۴ء

رجسٹرڈ نمبر L. 922
فون نمبر ـــــ 29

ایڈیٹر
آل احمد سرور

قیمت سالانہ چھ روپے
قیمت فی کاپی بیس پیسے

اشاعت کی تاریخیں
۱، ۸، ۱۵، ۲۲

ہفتہ وار
ہماری زبان

جلد ۳۱ | انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ | شمارہ ۱۶

آل احمد سرور

اقبال اور ہندوستان

اقبال کے انتقال کو آج چھتیس برس ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں شاعر اقبال کو بھلا دیا گیا ہے، صرف سیاست داں اقبال یاد ہے۔ اسی وجہ سے ہندوستان میں اقبال کو پاکستان کے تصور کے بانی کی حیثیت سے ہی دیکھا جاتا ہے اور پاکستان ہر وقت اقبال کا راگ الاپتا ہے در اصل شاعر اقبال کے ساتھ دونوں طرف بڑی بے انصافی ہوئی ہے۔ اقبال نہ بڑے قانون داں تھے نہ کوئی اہم سیاست داں اور مدبر۔ وہ ایک بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی بڑی اہمیت ہے اور یہ اہمیت آفاقی ہے۔ ان کی سیاست چند تقریروں اور مضامین سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ہمارے نزدیک یہ غلط سیاست تھی۔ مگر ان کی سیاست کی کجی کے باوجود ہمیں اردو کے اس بڑے شاعر کی عظمت کا اعتراف کرنا چاہیے اور اس اعتراف میں کسی سیاست کا دخل نہ ہونا چاہیے۔

آزادی سے پہلے اکثر قومی جلسوں میں اقبال کا ترانۂ وطنی "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گایا جاتا تھا۔ ادھر یہ رواج کم ہو گیا تھا۔ ہمیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دہلی کے اکثر اسکولوں میں یہ ترانہ اب پھر طلبہ گاتے ہیں۔ یہ ترانہ امر ہے۔ اقبال نے اس کے بعد جو دوسرا ترانہ ترانۂ ملی کے نام سے لکھا اس کی وجہ سے یہ ترانہ حرف غلط نہیں ہوتا۔ بانگ درا میں یہ موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت بھی، نیا شوالہ بھی، تصویر درد بھی، سید کی لوح تربت بھی اور رام اور کرشن اور نانک پر نظمیں بھی۔ انھوں نے آخر زمانے میں شعاع امید کے عنوان سے ایک نظم لکھی جو ضرب کلیم میں شایع ہوئی۔ اس نظم میں سورج کی کرنیں اپنی روشنی پھیلانے کے مشن میں ناکام ہو کر اپنے سرچشمے کو واپس لوٹ رہی ہیں مگر ــ

ایک شوخ کرن، شوخ مثال نگہ حور
آرام سے فارغ صفت جوہر سیماب
بولی کہ مجھے رخصت تنویر عطا ہو
جب تک نہ ہو مشرق کا ہر اک ذرہ جہاں تاب
چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردان گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحر پرآشوب ہے پایاب
چشم مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُر ناب

ہندوستان کی عظمت کا یہ رجز کیا ہم فراموش کر سکتے ہیں؟ کیا زندگی کے متعلق اس تصور کی کوئی اہمیت نہیں ــ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
آشکارا ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
ورنہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحر بے کراں ہے زندگی

اقبال کی ایک اور نظم کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ [illegible]

آدم سے کہتی ہے ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جدائی کے ستم دیکھ جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

اور اقبال کے یہاں مذہب کا یہ تصور بھی ملحوظ رہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بت کدۂ تصورات

کفر و ایمان کے متعلق یہ ارشاد بھی اہمیت رکھتا ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

بالِ جبریل میں اقبال کی ایک نظم ہے "پیر رومی و مرید ہندی" اس کے آخر میں مرید اور پیر کا مکالمہ دیکھئے ؎

مرید ہندی۔ ہند میں اب نور باقی ہے نہ سوز
اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

پیر رومی۔ کارِ مرداں روشنی و گرمی است
کارِ دوناں حیلہ و بے شرمی است

اقبال کا یہ تصور غلط تھا کہ قوم کی بنیاد مذہب ہے۔ مگر اس کی وجہ سے اقبال کی شاعری کو ہم نظر انداز نہیں کرسکتے اور جارحانہ قوم پرستی سے تو ہمیں بہر حال بچنا چاہیئے اور قومیت سے بالا تر بین الاقوامیت کی طرف ذہن کو لے جانا چاہیئے۔ اقبال کے یہاں قدیم و جدید دونوں کا احساس ملتا ہے۔ گو وہ قدیم کی طرف مائل تھے مگر جدید کے پیچ و خم کا انھیں بقول اقبال سنگھ ایک کرب کے ساتھ احساس تھا۔ اُن کے یہ اشعار کیسے نظر انداز کئے جاسکتے ہیں ؎

آئینِ نو سے ڈرنا طرزِ کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

کیفیت باقی پرانے کوہ و صحرا میں نہیں
ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

اور حیات کے تسلسل کے متعلق اُن کا ارشاد بھی ملحوظ رہے ؎

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصۂ جدید و قدیم

اقبال، غالب کے بعد ہمارا سب سے بڑا شاعر ہے۔ ٹیگور اور اقبال سے بڑے شاعر ہندوستان میں بیسویں صدی میں کہاں ہوئے۔ کالی داس کے فلسفے کو ماننا ضروری نہیں مگر شکنتلا کی عظمت کا اعتراف ضروری ہے تلسی داس نے رام چرت مانس میں عورتوں اور شودروں کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے تھے کیا ان کی وجہ سے ہم ان کی عظیم تصنیف کو نظر انداز کرسکتے ہیں۔ دانتے نے اور ملٹن کے مذہبی افکار سے قطع نظر ہم طربیہ خداوندی اور فردوس گم شدہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں، ڈبلو۔ بی ییٹس نے اپنی شاعری کی بنیاد آئرش اساطیر پر رکھی مگر ییٹس پھر بھی بڑا شاعر ہے، شاعر سے صرف یہ مطالبہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی تخلیق سے ہمیں زندگی کی گہری بصیرت عطا کرے اور اس میں انسانیت کے لئے گہری اخلاقی اور روحانی قدریں ہوں اور اس کے ذریعہ سے زندگی کی نئی تنظیم اور احساس اور شعور کی نئی توانائی پیدا ہو اقبال کے اشعار سے سیاست کے نسخے نہیں زندگی کے آداب سیکھنے چاہئیں۔ شاعر کے رمز و ایما کو بھی ریاضی کی اصطلاح نہیں سمجھنا چاہیئے شاعری کو افیون کی طرح بھی استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ اقبال کی شاعری میں حرکت، عمل، خودی، مساوات، اپنی تقدیر آپ بنانے، اپنی شخصیت کا نقش زمانے پر ثبت کرنے، ارتقا کے راز کو سمجھنے، خوب سے خوب تر کی طرف مائل کرنے اور ستاروں سے آگے عشق کے امتحان دیکھنے کی جو خصوصیت ہے وہ ہماری بہت بڑی دولت ہے۔ اس کے رمز و ایما کو سمجھنے کے لئے اس کی زبان اور شاعری کی زبان کی خصوصیات کو سمجھنا ضروری ہے۔ زندگی کے بکھرے ہوئے جلووں کو سمیٹ کر ایک آئینہ خانہ بنانے کی ہر کوشش شاعر کو کچھ محدود ضرور کرتی ہے گو یہ کوشش اپنی جگہ قابلِ تعریف ہے۔ اقبال، ٹیگور اور تلسی داس، دانتے اور ملٹن کی برادری میں ہیں غالب اور شیکسپیئر کا مقام ان سے بھی بلند ہے کہ یہ زندگی کے عاشق اور عارف پوری زندگی کو اپنی ساری نیرنگی اور بوقلمونی کے ساتھ دیکھنے اور دکھانے کے قائل ہیں۔ یہ کسی آفتاب سے کوئی چاند تراشنا ضروری نہیں سمجھتے نہ کسی عظیم الشان دریا پر بند باندھنے اور اسے کسی خاص سمت میں موڑنے کے قائل ہیں۔ مذہبی شاعری بھی بڑی شاعری ہوسکتی ہے اور سیکولر شاعری بھی مگر پہلے شاعری ہونا چاہیئے منظوم صحیفہ اخلاق یا سیاسی دستاویز نہیں۔

زیدی کی کتاب "دو ادبی اسکول" کو انعام

مشہور اردو شاعر اور تنقید نگار جناب سید علی جواد زیدی کی کتاب "دو ادبی اسکول" کو حکومت یو۔پی نے ادبی انعام کا مستحق قرار دیا ہے۔ زیدی صاحب نے اس کتاب میں دو دبستان شاعری لکھنؤ اسکول اور دلی اسکول کے سلسلۂ خیال سے اختلاف کیا ہے ان کے خیال میں آخری مغل دور کی اس کلاسکی شاعری کے رجحانات میں بڑی حد تک اشتراک پایا جاتا ہے زیدی صاحب کی انعام پانے والی کتابوں میں یہ چوتھی کتاب ہے۔

• انڈین ایکسپریس

اسلوب احمد انصاری

کتابوں کی باتیں

آج کی صحبت میں جن کتابوں پر گفتگو مقصود ہے' ان میں سب سے پہلی تصنیف خواجہ غلام السیدین صاحب مرحوم کا کتابچہ زبان زندگی اور تعلیم ہے' جسے حال ہی میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے بڑے ناصحانہ اور تشفیق انداز سے اور بہت شرح و بسط کے ساتھ تعلیم و تدریس کے عمل کے دوران اور زندگی میں عموماً زبان کے وظیفے پر روشنی ڈالی ہے۔ کتابچے کے پہلے حصے میں نت نئے طور سے یہ بات بہ اصرار ظاہر کی گئی ہے کہ زبان کی تعلیم کیوں ضروری ہے اور زندگی کی تہذیب اور شائستگی سے من کی دنیا کس طرح جلا پاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی قابل غور ہے کہ زبان کے بھونڈے' غیر اخلاقی اور غیر محتاط استعمال سے شخصیت کے صفاچشمے میں کس طرح کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ خواجہ صاحب مرحوم نے جگہ جگہ اس بات پر زور دیا ہے کہ زبان کی صفائی' سادگی اور جامعیت ایک ایسا معیار ہے' جسے ہر حال میں اپنانا ضروری ہے اور ہر بڑے مفکر' مبلغ اور شاعر کے یہاں زبان کی سادگی اور ذہن اور جذبے کی بڑائی' گہرائی اور گیرائی لازمی طور پر ایک دوسرے سے مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن خواجہ صاحب کے نقطۂ نظر کی خوبی کے باوصف کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان' اور خیال اور جذبے کے پیچیدہ مرکب کے درمیان ہمیشہ اور لازمی طور پر اس حد تک مطابق ہونا ضروری ہے اور نہ مبرم۔ کیونکہ زبان کے دقائق بڑے گوناگوں اور پرپیچ ہوتے ہیں۔ خاص طور سے ادب اور شاعری میں۔ اس سلسلے میں انگریزی شاعر ورڈز ورتھ نے ایک بہت پتے کی بات کہی ہے۔ اس کی رائے میں زبان ایسی قبا نہیں ہے' جسے خیال اور جذبے کے کیمیاوی امتزاج پر کسی سوچے سمجھے ہوئے منصوبے کے مطابق عاید کیا جا سکے۔ بلکہ زبان دراصل تجربے کا ایک قدرتی INCARNATION ہے اور اسی لیے جس طرح وہ معنی خیز تجربات جو ادب کی کائنات میں منضبط ہو کر سامنے آتے ہیں متنوع ہیں' اسی طرح ان کے INCARNATION کی شکلیں بھی رنگا رنگ اور اپنی الگ انفرادیت اور شخصیت کی حامل ہوتی ہیں۔ خواجہ صاحب مرحوم کی خصوصی دلچسپی کا میدان "تعلیمات" تھا اور وہ اس کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ عام تمدنی مسائل پر شائع ہونے والی کتابوں سے مستقل اور زندہ ربط رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کے اس مطالعے اور واقفیت کی مثالیں اس کتابچے میں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ لیکن بعض شخصیتوں سے عقیدت میں انھیں جو غلو تھا' اس کی وجہ سے بعض باتیں کچھ غلط ملط سی ہو گئی ہیں۔ لیکن اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ تعلیم اور دوسرے تہذیبی مسائل کے سلسلے میں ہمیشہ ایک صالح نقطۂ نظر کے حامل رہے' اور اعتدال اور میانہ روی کی تلاش ان کی مساعی کا مرکز و محور بنی رہی۔ مثلاً انھوں نے اس بات کی خاص طور پر مذمت کی ہے کہ موجودہ زندگی پر سائنس اور TECHNOLOGY کی ترقی کی وجہ سے میکانکیت کا غلبہ ہوتا جا رہا ہے جس نے انسان دوستی کی اقدار کی طرف سے ہمیں خطرناک حد تک بیگانہ بنا دیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:-

"یونیورسٹیوں میں سمسٹر سسٹم کا جو نیا طریقہ شروع کیا گیا ہے' اس میں اب تعلیم سے زیادہ امتحانوں پر زور ہے۔ اگر وہ (یعنی طالب علم) ایمانداری سے اپنا کام کریں' تو ان کو نہ فرصت ملتی ہے اور نہ اس بات کی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کبھی چپ چاپ کھڑے دنیا کے دھارے کو بہتا ہوا دیکھ سکیں' یا "غیر ضروری" کتابوں سے لطف اٹھا سکیں' یا شاعری سے ذہن میں جلا اور دل میں گرمی پیدا کر سکیں یا آرٹ یا موسیقی سے اپنی زندگی مالا مال کر سکیں۔ بیسویں صدی کی تہذیب اس جلد بازی کی یاد داشت کا شکار ہے۔" (ص ۵۱)

کتنی سچی اور دو ٹوک بات کہی ہے خواجہ صاحب نے۔ غالباً ہندوستان میں اب مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ ہی وہ واحد تعلیمی ادارہ ہے جس نے اس سسٹم کی تمام خامیوں کے باوجود (بلکہ شاید انہی کی وجہ سے) اسے اب تک اپنے گلے کا ڈھول بنا رکھا ہے۔ ممکن ہے یہ بھی اس یونی ورسٹی کی انفرادی شان کو نمایاں کرنے اور ارباب حل و عقد کی بلوغت فکر و نظر کو مشتہر کرنے کا ایک وسیلہ ہو۔ اس کتابچے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ مولانا حالی کے ایک ایسے اقتباس سے شروع ہوتا ہے' جو ان کی متوازن' مستحکم اور سجل نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ بھی ہے اور جس کی جامعیت اور بلوغت دسیوں مضامین اور کتابچوں پر بھاری بھی ہے۔

دوسری کتاب ڈاکٹر شارب ردولوی کی "مطالعۂ ولی" ہے۔ ابتدائیہ میں شارب صاحب نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ کتاب ولی کے کلام کی تدریس کے سلسلے میں ان کے تجربات سے وجود میں آئی۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اردو کے اس شاعر پر جو غزل گوؤں کی فوج کا ہر لحاظ سے ہراول تھا' خاطر خواہ مواد موجود نہیں ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے اور ولی کو عام قاری سے متعارف کرانے کے لیے انھوں نے ابتدائی پانچ ابواب میں ولی کے حالات زندگی' دکن کے سیاسی اور تہذیبی پس منظر اور ولی کی شاعری کے بعض پہلوؤں پر بحث کی ہے اور ان گوشوں کو منور کرنے کی کوشش کی ہے' جو اب تک عام قاری کی واقفیت کی رسائی میں نہ تھے۔ ان ابواب کے بعد ولی کے کلام کا انتخاب دیا گیا ہے۔ پہلے پہل کلیات ولی کو ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے بہت اہتمام اور کاوش کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ "مطالعۂ ولی" کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں الگ الگ عنوانات قائم کر کے ولی کے کلام کی افہام و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ "ولی کا فن" اس لحاظ سے مفید اور قابل ذکر باب ہے۔ لیکن دل چاہتا ہے کہ یہ گفتگو زیادہ

مفصل ہوتی اور زیادہ گہرا ہوں، تک گئی ہوتی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے "ولی سے اقبال تک" میں ولی کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اور جس کے حوالے شارب صاحب نے جا بجا دئے ہیں، اس سے آگے جا کر دیکھنے کی ضرورت اب محسوس ہوتی ہے۔ بہر "مطالعۂ ولی" ایک سنجیدہ کوشش ہے۔ انتخاب میں ولی کی اکثر نمائندہ چیزیں آگئی ہیں، اور فرہنگ کے شامل کرنے سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔

اس سلسلے کی تیسری کتاب حسن نعیم کا مجموعۂ کلام "اشعار" کے عنوان سے پیش نظر ہے۔ حسن نعیم کہنہ مشق شاعر ہیں اور ان کا کلام عرصے سے رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی اس متاعِ ہنر کو ہمیشہ سینت سینت کر رکھنا ہی مناسب خیال فرمایا، اور اب اپنے خاصے وافر ذخیرے میں سے نہایت جز رسی کے ساتھ ایک مختصر سا گلدستہ ترتیب دیا ہے۔ اس نے پہلی ہی نظر میں جو تاثر ذہن پر ابھرتا ہے، وہ شعوری قطع و برید کا ہے۔ ان کے یہاں الفاظ اور محاکات کے استعمال میں ایک سلیقہ، رکھ رکھاؤ اور التزام نظر آتا ہے۔ لیکن اندازِ بیان کا اختصار بعض جگہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کی تہ کے نیچے خیالات اور جذبات کچھ سکڑ کر رہ گئے ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی تعریف میں جو اشعار کہے گئے ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں۔ ویسے یہ مجموعہ تمام تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ اور یہ غزلیں حسن نعیم کے ذہنی اور جذباتی ارتقا کی مختلف منزلوں کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں جن جن تجربات اور آزمائشوں سے گزرے ہیں اور ذات اور غیر ذات کے تانے بانے سے مل کر جو بناوٹ سامنے آتی ہے، وہ ان غزلوں میں پوری طرح نمایاں ہے۔ غزل کا آرٹ بڑا نقاب پوش آرٹ ہے اور اس میں بہت سے پردوں کو اٹھا کر دیکھنے کے بعد ہی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون سے عوامل کس کس طرح مختلف قسم کی چھلنیوں میں سے چھن کر غزل کے مخصوص رموز و علائم کے ذریعے ظاہر کئے گئے ہیں۔ ایک بات البتہ خاصی یقینی معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ حسن نعیم کی شاعری میں کوئی جھلاہٹ یا تلخی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے ردِ عمل کو اس درجہ گوارا بنا لیا ہے اور اسے اپنے نفس کی آگ میں اتنا تپایا ہے کہ اس میں سے احتجاج اور چیخ کا عنصر تقریباً ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے ناسازگار حالات یا اس تصادم کے سامنے، جو روایت اور تجربے کے درمیان ناگزیر ہے، اور موجودہ تہذیب کے بحران کی ایک واضح نشانی ہے، سپر نہیں ڈالی ہے بلکہ وہ اس امید سے چمٹے نظر آتے ہیں کہ شاید یہ تہذیب اپنی تردید کے بطن سے اپنی حیاتِ نو کا سامان پیدا کر کے ایک خوشگوار مستقبل کی طرف بڑھ سکے۔ ان کے اس مجموعے میں سے چند منتخب اشعار جو ان کے مخصوص رنگ کی نمائندگی کرتے ہیں یہ ہیں:

یاد کا پھول سرِ شام کھلا تو ہوگا
جسم با ذوق سی خوشبو میں بسا تو ہوگا

تذکرہ ... بہار ... طلب
تجھ پہ جو بیت گئی بات سنا تو ہوگا

کوئی موسم ہو یہی سوچ کے جی لیتے ہیں
اک نہ اک روز شجرِ غم کا ہرا تو ہوگا

جنوں سے قیمتِ حسنِ طلب وصول کرو
میرا سلام، مری بندگی قبول کرو

مرے لہو میں ہیں خوابیدہ ابر و بادِ حیات
مجھے نہ یاس کے طوفان اپنی طول کرو

میں دھوپ کے پاس کھڑا ہوں نکل چلو اس سے
تم اپنے خواب سے بچنے کی اب نہ بھول کرو

جب کبھی میرے قدم سوئے چمن آئے ہیں
اپنا دکھ درد لئے سرو و سمن آئے ہیں

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی
اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں

جھاڑ لو گردِ مسرت کو، بٹھا لو دل میں
بھولے بھٹکے ہوئے کچھ رنج و محن آئے ہیں

جب لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلفِ خیال
یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

دل میں اتر و گے تو اک جوئے وفا پاؤ گے
موج در موج سمندر کا پتا پاؤ گے

میں تو کھو جاؤں گا تنہائی کے جنگل میں کہیں
تم بھرے گھر میں کہاں مجھ کو بھلا پاؤ گے

دل سے بے ساختہ اٹھے ہیں ڈھاک کی دست
آج آنسو کی ہم رنگِ حنا پاؤ گے

آگ ہی آگ سہی خواب میں چل کر دیکھو
اس جہنم میں بھی جنت کی ہوا پاؤ گے

دامن کو اپنے چاک کرو یا رفو کرو
خوابوں سے دل لگاؤ کوئی آرزو کرو

شاید کہ شب میں پھر کوئی آئے مسیح دم
شامِ فراق تم بھی جگر کو لہو کرو

آئے گی کس کے کام یہ رعنائیٔ خیال
نغمو! دیارِ فکر میں رہنے کی خو کرو

کب تک تلاشِ حسن میں بھٹکوگے دشت دشت
جو ذرہ سامنے ہو اسے لالہ رو کرو

اتنا رویا ہوں غمِ دوست ذرا سا ہنس کر
مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے

کس گھڑی کون سی وحشت میں کرے مجھ کو شریک
عشق کی ایک اسی بات سے جی ڈرتا ہے

ہجر کا درد نئی بات نہیں ہے لیکن
دن وہ گزرا ہے کہ اب رات سے جی ڈرتا ہے

اس ضمن میں چوتھی اور آخری کتاب ساجدہ زیدی کا تازہ مجموعہ "آتشِ سیال" ہے۔ "اشعار" کے برعکس جس کا ذکر ابھی ختم ہوا، اس میں ایک جھلاہٹ، تلخی اور ناآسودگی جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی اس میں ایک توانائی اور ندرت بھی ہے۔ ساجدہ زیدی نے باقاعدہ شاعری ۱۹۵۰ء کے آس پاس شروع کی۔ خواتین شعرا میں ان کی آواز

منفرد بھی ہے اور امکانات کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ تعارف میں انھوں نے اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اسی کو ایک حد تک شعوری انداز بیان میں "ایک نظم" میں "وہ تصویر نہیں" میں پیش کیا ہے۔ دونوں جگہ اعتدال اور تناسب کی کمی کا احساس ہوتا ہے اور لہجے میں ضرورت سے زیادہ بلند آہنگی کھٹکتی ہے ساجدہ زیدی کے سلسلے میں اور غالباً کسی بھی شاعر کے سلسلے میں یہ بات کچھ بہت زیادہ اہم نہیں ہے کہ وہ کسی فلسفیانہ نظام فکر یا آرٹ کے کسی اسکول سے متاثر ہوا یا نہیں۔ اہم تر بات یہ ہے کہ کسی نظم کی تہ میں جو تجربہ پایا جاتا ہے وہ پختہ، ہمہ گیر اور معنی خیز ہے یا نہیں۔ تجربے کی سچائی کو بھی آخری اور قطعی معیار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ساجدہ زیدی کی نظمیں یقیناً ہمیں اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔ البتہ ان کے یہاں ناہمواری خاص نظر آتی ہے۔ نظم کی شاعری میں بھی معروضیت (OBJECTIVITY) کے باوجود ایک اندرونی ترتیبی (INWARDNESS) کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ اور اسی میں دراصل اس کی قوت کیفیت کا راز چھپا ہوتا ہے۔ ساجدہ زیدی کی دو نظمیں "تماشائی" اور "مشرق اور مغرب کا نقطۂ اتصال" اسی (INWARDNESS) کی کمی کی وجہ سے کمزور نظمیں ہیں۔ شروع کی نظموں میں وہ اپنے آپ میں بے حد الجھی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان نظموں میں ایک بے پایاں اضطراب، ایک مبہم ناصبوری اور بے کلی ملتی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں وہ الفاظ اور محاکات کی فراوانی کی وجہ سے دھند میں لپٹا ہوا ہے۔ لیکن اس مجموعے میں بعض بہت اچھی نظمیں بھی ہیں، جو ایک جدید توانا ذہن اور ایک مرتعش ادراک کی تخلیق اور تراوش معلوم ہوتی ہیں۔ ساجدہ زیدی اب اپنی شاعری کے تجرباتی دور سے نکل کر ذہنی اور جذباتی بلوغت کی منزل میں داخل ہو چکی ہیں۔ ان کی ایک نسبتاً ابتدائی نظم "سوالات کے دائرے" کا مقابلہ اگر ایک بعد کی نظم "دائروں کا سفر" سے کیا جائے، تو بات واضح ہو جائے گی۔ پہلی نظم ناپختہ اور ادھوری ہے اور دوسری میں ایک طرح کے اشاراتی اظہار بیان SYMBOLIC MODE میں تشکیل بخش قوت گویائی کا پتہ چلتا ہے۔ اس مجموعے میں اچھی اور معیاری نظموں وہی ہیں، جہاں یہ انجذابیت (IMMERSIVENESS) ایک سنبھلے اور ٹھہرے ہوئے انداز میں اور جامعیت کے ساتھ اجاگر ہوئی ہے۔ یہاں وہ انداز بیان پر قادر معلوم ہوتی ہیں، اس کے رحم و کرم پر تکیہ نہیں کرتیں۔ اس مجموعے میں جو نظمیں مجھے پسند آئیں، وہ ہیں "لندن کی ایک رات"، "متاعِ درد"، "وقت اور انجام"، "لالۂ صحرائی"، "کوئی دریچہ کھولو"، "تو شب آخر بیتا"، "اکائی" اور "دائروں کا سفر"۔ ساجدہ زیدی کے صیقل شدہ اور نکھرے ہوئے انداز بیان کی ایک مثال دیکھئے۔ نظم کا عنوان ہی "ایک نظم" ہے:

افق سے ابھرا تو ہے
خون میں نہا کر چاند!
یہ روشنی ہے کہ دکھی ہوئی لہوں کی بوند

ہتھیلیوں پہ اگائے ہیں آرزو کے کنول
چراغِ زخم جلائے ہیں شب کے سینے میں
رگوں میں زہر کو دوڑا دیا لہو کی طرح
ہر ذرّہ پہ قطرۂ شبنم میں آگ دہکائی
ہر ایک لمحہ کو ایک عمر کا خراج دیا
ہر ایک خار کو سو آبلوں کی رعنائی
عجیب بھی نہیں کچھ ایسا دشتِ تنہائی

(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی)

عروج زیدی

غزل

آپ کے غم کو نشاطِ دو جہاں کہنا پڑا
آنسوؤں کو نغمۂ سازِ فغاں کہنا پڑا

دل پہ جو بیتی اب اس کا تذکرہ بے سود ہے
جب زمیں کی پستیوں کو آسماں کہنا پڑا

میں کہ تھا اک پردہ دارِ روحِ تخلیقِ جہاں
بزمِ آب و گل میں رازِ کُن فکاں کہنا پڑا

خود بخود جب موسمِ گل میں یہ لو دینے لگے
تنکے تنکے کو چراغِ آشیاں کہنا پڑا

اس کی وسعت آپ کے حسنِ تغافل کا کمال
ایک لفظِ آرزو کو داستاں کہنا پڑا

جبر کی یہ انتہا ہے تلخیوں کے باوجود
ہر نفس کو حاصلِ عمرِ رواں کہنا پڑا

اللہ اللہ یہ عنایت، یہ نوازش یہ کرم
آپ کے غم کو غمِ راحت رساں کہنا پڑا

دردِ دل اک طرفہ نعمت ہے یہ جس کو مل گئی
بہرہ یاب وہ نہ ہو کون و مکاں کہنا پڑا

کیا بتاؤں کس کی جانب یہ اشارہ ہے عروج
اک سکوں دشمن جسے آرامِ جاں کہنا پڑا

مراسلات

کلکتہ میں اردو کے مسائل

اگرچہ مغربی بنگال میں علمی کام بہت ہوئے ہیں مگر ادبی اعتبار سے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ اس صوبہ کا مرکزی شہر کلکتہ ماضی میں اردو کا بھی ایک اہم مرکز رہا ہے لیکن یہاں اب عرصہ سے جمود طاری ہے آزادی کے بعد یہاں صرف دو چار ہی قابل ذکر نثر نگار اور شاعر منظر عام پر آئے ہیں۔

کلکتہ نہ صرف بنگال بلکہ پورے ملک کا ایک اہم صنعتی شہر ہے یہاں اردو بولنے والوں کی بھی خاصی تعداد آباد ہے۔ مگر اردو کی ترقی و ترویج میں انھوں نے کچھ زیادہ نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس کی فضا ادب کی ترقی کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہیں۔ اس شہر میں خاص طور پر دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار اور مزدور۔ اور ان دونوں طبقوں کو زبان و ادب سے کوئی فطری دلچسپی نہیں ہوتی۔ زبان و ادب سے دلچسپی زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگوں کو ہوتی ہے جن کا یہاں فقدان ہے۔

کلکتہ کا مزاج تجارتی اور کاروباری ہے۔ یہاں ہر شخص تجارتی انداز میں سوچتا ہے اور روپیہ کمانے کی دھن میں لگا رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کلکتہ میں زیادہ تر وہ لوگ آباد ہیں۔ جو مستقل یہاں کے باشندے نہیں ہیں۔ ان کے آباو اجداد صدیوں پہلے اپنے وطن سے یہاں آئے تھے اور طلب منفعت کے لئے یہیں کے ہو رہے۔

یہ لوگ ابھی تک خود کو بنگالی تصور نہیں کرتے۔ بنگال میں رہ کر بھی اب تک بنگلہ زبان نہیں سیکھ سکے اور اس ماحول میں رہ کر اردو کو بھی بھول گئے۔ یہ لوگ ایک کھچڑی زبان "کلکتیا بولی" میں گفتگو کرتے ہیں۔ اردو داں تاجروں میں زیادہ تعداد متوسط درجہ کے لوگوں کی ہے۔ اس لئے یہ لوگ ہر وقت اپنے کاروباری الجھنوں میں گرفتار رہتے ہیں۔ اب رہا مزدور طبقہ تو اس میں علم کی کمی کی وجہ سے اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ وہ زبان و ادب کی ترقی کے لئے کوئی عملی قدم اٹھا سکے۔ پھر بھی انہی درمیانہ درجہ کے تاجروں اور مزدوروں میں کچھ تعلیم یافتہ لوگوں کو اردو سے دلچسپی ہے یہ علمی طبقہ جس میں اسکولوں کالجوں اور یونی ورسٹی کے طلبہ و اساتذہ شامل ہیں اپنی بساط کے مطابق اردو ادب کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔ لیکن معاشی وسائل کی کمی اور گرانی میں روز افزوں اضافہ کی وجہ سے یہ لوگ زیادہ تر پریشان حال رہتے ہیں اور پوری توجہ اس طرف نہیں صرف کر سکتے۔ کلکتہ میں صرف چند اسکول ایسے ہیں جہاں اردو میڈیم سے پڑھائی ہوتی ہے۔ دو ایک کالجوں میں بھی اردو پڑھائی جاتی ہے۔ کلکتہ یونی ورسٹی میں اردو کا شعبہ الگ نہیں بلکہ یہ ماڈرن انڈین لینگویج کے شعبہ سے منسلک ہے۔ اس میں اردو کے لئے صرف دو مستقل اور ایک پارٹ ٹائم لیکچرر کام کرتے ہیں۔

ان حالات میں یہاں اردو کو پروان چڑھنے اور پھلنے پھولنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے اب اردو دوستوں کو یہ سوچنا ہے کہ کیا تدابیر اختیار کی جائیں جن کو بروئے کار لانے سے اس علاقہ میں بھی اردو زبان و ادب کی ترقی کی دوڑ میں شمالی ہند کے دوسرے علاقوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکیں۔ اس علاقے کے اردو دوستوں کو مل بیٹھ کر اس مسئلہ پر سنجیدہ غور و فکر کی دعوت دی جاتی ہے۔ امید ہے کہ ہماری آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوگی۔

کلکتہ — ۰ ایم۔ اے۔ نصر

ادیبوں اور شاعروں کے مجسمے

ہماری زبان اور دیگر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جناب طاہر ایم سعید نے متعدد ادیبوں اور شاعروں کے مجسمے بنائے ہیں۔ جن میں اب تک غالب، سر سید اور سردار جعفری کے مجسموں کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ مگر اب تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ ان میں سے کسی کی کہیں پذیرائی ہوئی ہو۔ میری رائے میں غالب کا مجسمہ ایوان غالب یا غالب اکاڈمی کی زینت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اور سر سید کے مجسمہ کے لئے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی زیادہ موزوں جگہ ہے۔ دیگر شعرا اور ادیبوں کے مجسموں کے لئے مرکزی اردو بورڈ اور اتر پردیش اردو اکاڈمی سے زیادہ کوئی موزوں مقام نہیں معلوم ہوتا ہے ان اداروں میں ان مجسموں کی تنصیب سے نہ صرف ان ادیبوں اور شاعروں کی یادگاریں قائم ہو سکتی ہیں جنھوں نے عمر بھر گیسوئے اردو کو سنوارنے میں اپنے شب و روز صرف کئے ہیں بلکہ اس نوجوان فنکار کی حوصلہ افزائی بھی ہو سکتی ہے جس نے اردو کے ان محسنوں کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ توقع ہے کہ مندرجہ بالا اداروں کے کرتا دھرتا اور اراکین اس طرف توجہ کریں گے۔

رہٹا ۰ مودود صدیقی

غلام علی عشرت

(۱)

جناب توفیق احمد قادری چشتی کے استفسار (ہماری زبان ۸ر اپریل سنہ ۷۲ء) کے جواب میں عرض ہے کہ سید غلام علی مشہدی عشرت بریلی کے ساکن تھے۔ سنہ ۱۲۲۱ ہجری میں وہ رام پور پہنچے اور خانصاحب محمد عثمان خاں واحد خاں کے یہاں مقیم ہوئے۔ خانصاحبان کے ایک دوست مولوی قدرت اللہ شوق کے مکان پر ہر جمعہ کو ایک مشاعرہ ہوا کرتا تھا عشرت بھی اس میں جاتے تھے ایک روز

شوق صاحب نے عشرت سے کہا کہ ان کے ایک مرحوم دوست نجو خاں کے ساتھ میر ضیاء الدین عبرت شاہجہاں پوری اکثر ان کے (شوق صاحب کے) یہاں آتے جاتے تھے۔ عبرت نے نجو خاں کے کہنے سے ملک محمد جائسی کی تصنیف پدماوت کا بزبان ریختہ ترجمہ کرنا شروع کیا تھا لیکن حکایت جب رتن سین کے جوگی بن کر سنگلدیپ پہنچنے تک پہنچی تو عبرت کا انتقال ہوگیا اور ترجمہ نامکمل رہ گیا سات آٹھ برس سے وہ ترجمہ اسی طرح نامکمل ہے آپ اسے مکمل کردیں۔ چنانچہ عشرت نے ڈیڑھ مہینے میں وہ ترجمہ مکمل کرکے "تاریخ اتمام تصنیف شاعر" (سنہ ۱۲۱۱ ہجری/ ۹۷-۱۷۹۶ عیسوی) سے نکالا۔

ایک شاعر کی حیثیت سے عشرت کو کوئی مرتبہ حاصل نہیں وہ نہایت معمولی قسم کے شاعر تھے اور ترجمے کے اصول سے قطعاً نابلد۔ انھوں نے اصل پدماوت کے قصے کو اردو مثنوی کا جامہ پہنا دیا ہے اسے کوئی ادبی حیثیت حاصل نہیں۔ عشرت کی تاریخ وفات معلوم نہیں۔

عبرت و عشرت کے ترجمے کے بازاری ایڈیشن کسی زمانے میں عام ملتے تھے۔ بھارت الکٹرک پریس سہارنپور کا چھپا ہوا ستانوے صفحوں کا "اردو پدماوت از عبرت و عشرت" نامی ایک نسخہ ڈاکٹر گیان چند جین کے پاس موجود ہے مندرجہ بالا معلومات اسی کے دیباچے کی یادداشت سے اخذ کی گئی ہیں۔

توفیق احمد صاحب اگر استفسار کے پردے میں جلدی کی گنگا شہر کا میرا جاکر اشتہار دینا چاہتے ہیں تو ان کی اطلاع کے لئے یہ عرض کیا جاتا ہے کہ زیر نظر مخطوطہ دیوان غالب بخط غالب کی طرح جنس نایاب نہیں ہے راقم الحروف نے علی گڑھ ہی میں عبرت و عشرت کے اس ترجمے کے دو مخطوطے دیکھے ہیں، ایک ہے مولانا آزاد لائبریری (مخطوطات سیکشن) میں پدماوت۔ کنور سین رتن سین، از مولوی عبرت و غلام علی عشرت (نشان ۴۶/۱۳ ادب) اور دوسرا انجمن ترقی اردو کے کتب خانے میں "مثنوی شمع و پروانہ۔ عبرت و عشرت۔ نشان ۱۴ ...۹۱"۔

بجنور۔ (ڈاکٹر) پرکاش مونس

(۲)

۸ر اپریل ۱۹۹۲ء کے شمارہ اخبار "ہماری زبان" کے صفحہ ۸ کالم ۴ پر جناب توفیق احمد قادری چشتی امروہوی نے اردو کی مشہور مثنوی "پدماوت" کے مصنف غلام علی عشرت کے بارے میں استفسار کیا ہے۔

غلام علی عشرت بریلی کے رہنے والے تھے۔ مرزا علی شاگرد مرزا سودا سے نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ دیباچہ کتاب میں سبب تالیف کے ذیل میں عشرت نے اپنا مفصل حال لکھا ہے۔

اس مثنوی کا ایک مطبوعہ نسخہ خال محترم مولانا حکیم سید ظہیر احمد برکاتی کے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۸۵ء کا مطبوعہ ہے اور مطبع نولکشور کانپور میں چھپا ہے مثنوی پدماوت "نایاب یا کمیاب نہیں ہے۔ تقریباً تمام ہی کتب خانوں میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ سرکاری اور بڑے کتب خانوں اور لائبریریوں کے علاوہ اکثر علمی خانوادوں کے ذاتی کتب خانوں میں بھی اس کے نسخے مل سکتے ہیں۔

رضا لائبریری رامپور میں ۱۲۷۵ھ کا مطبع مصطفائی کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔ مارچ سنہ ۵۸ء کے رسالے آجکل دہلی میں اس مثنوی پر جناب دلدار حسین خاں کا ایک تفصیلی مضمون بھی شائع ہوا ہے یہ مثنوی دو شاعروں کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے۔ اس کا ابتدائی حصہ حکیم میر ضیاء الدین عبرت کا مصنفہ ہے۔ ان کے انتقال کے بعد بقیہ حصہ کی تکمیل غلام علی عشرت نے مولوی قدرت اللہ شوق کی فرمائش پر کی ہے۔

ٹونک۔ • سید منظور الحسن برکاتی

ڈائرکٹر خط و کتابت اردو کورس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام چند خطوط

(۱)

جناب ڈائرکٹر صاحب (صاحب)

۱۱ اور ۲۵ سبق (صفحے) پڑھنے کے بعد (بعد) میں نے خط (خط) نہیں لکھا کیونکہ (کیونکہ) ۲۳ سبق (صفحے) بھی جلدی ہی ختم ہونے والے تھے۔ پڑھنا سمجھنے میں کچھ کٹھنائی ضرور (ضرور) آئی پر مدد لیکر کام پورا کیا۔ قریب تین گھنٹے روزانہ (روز) لگا (لگا) کر ۲ دن میں پڑھنا ختم کیا۔ اس خط (خط) کو پڑھنا کے ایک پیج کی نقل کے بدلے میں لکھ رہا ہوں۔ دوسری منزل (منزل) کی کتاب کا انتظار کر رہا ہوں۔

رانی کھیت۔ • گریش بہاری

(۲)

سونئے نویدن یہ ہے کہ میں اردو سیکھنے کی بہت پربل اچھا رکھتا ہوں لیکن آپکے مارگ درشن کے بنا مجھے اردو نہیں آسکتی۔ اردو کی میرے جیون میں بہت آوشکتا ہے۔ کیونکہ مجھے اسلام کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اس لئے میرا اسلام میں ہونا نہ ہونے کے برابر ہے ویسے میں نے دسویں کچھا ہندی سے پاس کی ہے کنتو اردو نہ آنے سے مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ یدی آپ نے مجھے اپنے کورس میں پرویش دیا تو میری زندگی روشن ہو جائے گی۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔

بجے پور۔ • شفیع محمد خاں

(۳)

میں اردو پڑھنا چاہتی ہوں میں بی۔اے ترتیہ ورش کی چھاترا ہوں اور اب ترتیہ ورش کی پریکشا دے رہی ہوں۔ کیا میں اردو سیکھ سکتی ہوں، یدی ہاں تو آپ مجھے پوری جانکاری دیں کہ میں کس طرح اردو سیکھ سکتی ہوں یا مجھے کیا کرنا ہے۔ پورن وورن بھیجیں۔

دہلی۔ • راجندر کور

اخبار و اذکار

اتر پردیش میں اردو یونی ورسٹی کا قیام زیر غور

نئی دہلی:- وزیر تعلیم سماجی بہبود پروفیسر نورالحسن نے کل لوک سبھا میں ایک سوال کے تحریری جواب میں بتایا کہ اتر پردیش کی حکومت ریاست میں اردو یونی ورسٹی قائم کئے جانے کے سوال پر غور کر رہی ہے۔ حکومت کے سامنے کسی نے کوئی تجویز نہیں پیش کی ہے ——— اپنی وزارت سے متعلق مشاورتی کمیٹی کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے پروفیسر نورالحسن نے کہا ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا معیار بلند کرنے کے لئے حکومت ہر بلاک میں ایک مثالی پرائمری اسکول اور ایک ثانوی اسکول قائم کرنے کی ایک تجویز پر غور کر رہی ہے۔ • سیاست کانپور

عربی فارسی امتحانات کے سلسلے میں وزیر تعلیم سے ملاقات

نئی دہلی:- یو پی کے ممبران اسمبلی و کونسل کا ایک وفد طے شدہ پروگرام کے مطابق مولانا عبدالروف ایم۔ ایل۔ سی کی سربراہی میں وزیر تعلیم اتر پردیش سے اسمبلی ہاؤس میں ملا۔ ملاقات کے وقت ڈائرکٹر تعلیمات، سکریٹری تعلیمات، انسپکٹر عربی، فارسی امتحانات وغیرہ موجود تھے۔ وفد نے شکایت کی تھی کہ الہ آباد کے عربی، فارسی کے امتحانات کی بنا پر سرکاری درسگاہوں وغیرہ میں جو سہولت ہمیشہ سے چلی آرہی تھی وہ سنہ ۷۲ء سے چھین لی گئی ہے اسے بحال کیا جائے اور ایسے کامیاب لوگوں کو بحیثیت لسانی ٹیچر کے ملازمت کی سہولت دی جائے ضرورت ہے کہ عربی، فارسی کے لئے بھی سنسکرت کی طرح ایک بجٹ بنا کر گرانٹ دی جائے جبکہ اتر پردیش میں ۵۰۰ ایسے اسکول ہیں اور ان میں ۲۰ ہزار کے قریب لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔

یہ مدارس سرکاری نصاب رائج کر کے عربی، فارسی کے ساتھ اردو، ہندی کی درجہ پنجم تک باضابطہ تعلیم دیتے ہیں۔

• الجمعیۃ دہلی

اردو گزٹ کو نظر انداز کرنے پر سرکار کی طرف سے تنبیہ

لکھنؤ:- حکومت اتر پردیش کے ایک ذمہ دار نے باضابطہ طور پر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ سرکاری محکمے اردو گزٹ کو محکمہ جاتی اطلاعات بھیجنے سے گریز کرتے ہیں۔ چنانچہ "بھاشا ویبھاگ" کے ذمہ دار سکریٹری جناب منوہر لال گپتا نے تمام محکموں کے نام ایک گشتی خط کے ذریعہ اس پر سخت تنبیہ کی اور محکمہ جاتی کارروائی کرنے کی آگاہی دی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حکومت نے اردو کے مسئلے میں اس قسم کا خط جاری کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ حکومت کو یہ معلوم ہوا ہے کہ متعدد محکمے ہندی گزٹ میں قابل اشاعت چیزیں تو بھیج دیتے ہیں لیکن اس کا اردو ترجمہ جو اردو گزٹ میں شائع ہونا چاہیئے نہیں بھیجا جاتا ہے۔ یا بہت تاخیر سے بھیجا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ یہ چیزیں اردو گزٹ میں یا تو شائع ہی نہیں ہو پاتیں یا بہت تاخیر سے شائع ہوتی ہیں۔

یہ صورت حال غیر مناسب ہے اور اس سے اردو بولنے والوں کو شکایت کا موقع ملتا ہے۔

شری گپتا نے اس سلسلے میں محکموں کو ہدایت کی ہے کہ دونوں زبانوں (یعنی اردو اور ہندی) میں شائع کی جانے والی چیزیں جہاں تک ممکن ہو ایک ساتھ ہی روانہ کی جائیں اور متعلقہ محکمے یہ بھی اپنے طور پر یقین کر لیں کہ دونوں زبانوں میں یہ چیزیں ایک ساتھ ہی (گزٹ میں) شائع ہوئی ہیں۔

انھوں نے ہدایت کی ہے کہ مستقبل میں اس سلسلے میں اس قسم کی لاپروائی اور ڈھیل ڈھال نہ برتی جائے اور اگر اس کی کوئی مثال آئندہ سامنے آتی ہے تو ذمہ دار اہلکار کے خلاف سخت محکمہ جاتی کارروائی کی جائے گی۔ • قومی آواز لکھنؤ

اردو خوشنویسی اسکول

لکھنؤ:- اردو خوشنویسی اسکول کمیٹی کا ایک جلسہ کوٹھی چودھری حیدر حسین میں زیر صدارت جناب سبط رضی صاحب ایڈوکیٹ منعقد ہوا جس میں اسکول کا دستور العمل چند ترمیمات کے ساتھ منظور ہوا اور

اسکول کا افتتاح پکچر گیلری حسین آباد میں ماہ مئی کے دوسرے ہفتہ میں کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔

اس اسکول میں طالب علموں کو فن خوشنویسی کے اصول و قواعد بتائے جائیں گے اور خوشخط اردو لکھنے کی تربیت دی جائے گی۔

ایک دوسری تجویز کے ذریعے تمام اردو دوستوں کو فن خوشنویسی کو فروغ دینے کے لیے اسکول کمیٹی سے تعاون کرنے کی اپیل کی گئی۔

• قومی آواز، لکھنؤ

اردو کے متعلق پچھلے وعدوں کی یاد دہانی

حیدرآباد:۔ پروفیسر حبیب الرحمٰن معتمد عمومی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے حسب ذیل بیان جاری کیا ہے۔ اخبارات نے حال ہی میں یہ اطلاع شائع کی ہے کہ آندھرا پردیش کی حکومت نے حکم جاری کیا ہے کہ ضلع پریشدوں کے تمام دفاتر میں ہر قسم کی مراسلت کے لئے نیز اجلاس کی روئیدادیں لکھنے کے لئے صرف تلگو کا استعمال کیا جائے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا باعث دلچسپی ہوگا کہ دسمبر ۱۹۶۲ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے منعقدہ کل آندھرا پردیش اردو کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے اس وقت کے چیف منسٹر جناب ڈی سنجیویا نے اور بہت سی باتوں کے علاوہ حسب ذیل اعلان بھی کیا تھا۔ تلنگانہ کے تمام اضلاع اور ان کے علاوہ گنٹور، کرنول اور کڑپہ کے تینوں اضلاع میں ضلع پریشدوں کی روئیدادیں تلگو کے ساتھ اردو میں بھی لکھی جائیں گی۔ اسی قسم کی سہولتیں پنچایت سمیتیوں میں بھی دی جائیں گی۔ اگر وہاں اردو جاننے والوں کی کم از کم دس فیصد آبادی ہو۔ یہی صورت ان بلدیات میں بھی برقرار رہے گی جہاں اردو جاننے والوں کی کم از کم دس فیصد کی آبادی ہو۔ اس اعلان کا مقابلہ اگر اس حکم سے کیا جائے جو اب حکومت نے جاری کیا ہے تو اس "ترقی" کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اردو کو ریاست آندھرا پردیش میں حاصل ہو رہی ہے۔

• سیاست حیدرآباد

ریاستی حکومت اردو کو نظر انداز نہیں کرتی

حیدرآباد:۔ وزیر پنچایت جناب ٹی ہیگریو اچاری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو جیسی زبان کو نظر انداز کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جسے ریاست میں تلگو کے بعد دوسری بڑی اکثریت بولتی ہے جناب ہیگریو اچاری کل رات موضع کاریلی تعلقہ نظام آباد میں ایک تہنیتی تقریب میں تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور پرامن بقائے باہم کا باعث بنا رہی ہے چیف منسٹر جناب پی وی نرسمہا راؤ کی قیادت میں اردو والوں کے مفادات بہر طور محفوظ رہیں گے۔ انھوں نے کہا جس طرح اردو کو اسکولوں اور جونیر کالجوں میں ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اعلیٰ تعلیم کے لئے بھی اس زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا جائے گا انھوں نے اس بات سے انکار کیا کہ اردو بولنے والے ملازمین کے ساتھ کوئی ناانصافی کی جا رہی ہے۔

• سیاست حیدرآباد

آندھرا پردیش میں جی او ۱۸۰۰ کے خلاف آوازیں

(۱)

حیدرآباد:۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام ریاست میں اردو کے موقف اور جی او (۱۸۰۰) پر منعقدہ سمپوزیم میں مختلف مکاتب خیال کی نمائندگی کرنے والے قائدین، ادیبوں، دانشوروں اور طلبہ نمائندوں نے اس بات پر زور دیا کہ آندھرا پردیش میں اردو کے جائز مقام اور موقف کے حصول اور تحفظ کے لئے تمام اردو والے اپنی سیاسی اور دوسری وابستگیوں اور مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر ایک پلیٹ فارم پر آجائیں اور متحدہ طور پر حکومت اور چیف منسٹر سے نمائندگی کریں۔ اور اگر حصول انصاف میں ناکامی ہو تو متحدہ جد و جہد شروع کریں اردو والے چاہتے ہیں کہ اردو زبان کو اس ریاست میں قانونی موقف حاصل ہو جائے۔ سمپوزیم میں متعدد سربرآوردہ رہنما و قائدین نے جی او میں اردو کے حق میں ترمیم کرنے کی وکالت کی۔

• سیاست حیدرآباد

(۲)

حیدرآباد:۔ مولانا ابو یوسف ایم ایل سی نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام ریاست کے جی او ۱۸۰۰ پر منعقدہ سمپوزیم کو کار آمد کوشش کا نام دیتے ہوئے اپنے صحافتی بیان میں کہا کہ گذشتہ (۲۵) سال سے اردو زبان کے ساتھ مرکز سے کر ریاستوں تک میں جس قدر ناانصافیاں ہوئی ہیں۔ اس کے پیش نظر زبان اردو کا ہر لحظہ کسی درجہ کنارہ رہنا از بس ضروری ہے۔ اگرچہ میری دانست میں زیر بحث جی او اردو داں طبقہ کے تقررات میں حائل نہیں اور

نہیں اردو زبان کے بارے میں موجودہ حکومت کی حکمت عملی کا مظہر ہے لیکن ابھی ان حالات میں جبکہ تعلیم کی سطح پر گریجویشن کی حد تک تلگو ذریعہ تعلیم اختیار کیا گیا ہے اور ایسے مرکزی اداروں میں ذمہ دار عہدوں پر تلگو داں افراد کے تقرر کی گشتی میں صراحت کی گئی ہو فوری معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان اور اس کے ذریعہ تعلیم کے ادارہ جات کے بارے میں غیر مبہم اور واضح اعلانات کئے جائیں۔ توقع ہے کہ چیف منسٹر جو خود بھی اردو زبان کے اچھے ادیب اور خطیب ہیں خوشگوار ماحول میں اردو کے مسائل حل کرنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

• سیاست حیدرآباد

(۳)

حیدرآباد: صدر اردو سبھا جناب راجہ لعل راجہ نے اپنے ایک صحافتی بیان میں ریاستی وزیر تعلیم اور چیف منسٹر آندھرا پردیش سے پرزور اپیل کی ہے کہ ...... ۱۸۱ جی او کسی طرح بھی اردو داں طبقہ کے لئے انصاف پر مبنی نہیں ہے مسلسل پچیس برسوں سے انجمن ترقی اردو اور دیگر ادبی تہذیبی ادارے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی آئینی جدوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن اس جدوجہد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہو سکا ہے۔ یہ بات اردو والوں کے لئے باعث تشویش ہے۔ انھوں نے بیان کے آخر میں حکومت پر زور دیا ہے کہ اگر وہ اندرون پندرہ یوم مذکورہ جی او کو واپس نہ لے تو اردو سبھا حکومت کی اس معاندانہ رویہ کے خلاف زبردست جدوجہد کا آغاز کرے گی اور اگر ممکن ہوا تو بھوک ہڑتال کا آغاز کر دیا جائے گا۔

• رہنمائے دکن

(۴)

حیدرآباد: جناب اسحاق ملک سکریٹری انجمن تعمیر ادب آندھرا پردیش نے اپنے ایک صحافتی بیان میں جی۔او نمبر ۱۸۱ کو واپس لینے کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس جی۔او سے اردو داں طبقہ میں سخت تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے انھوں نے اپنے بیان میں صدر اردو سبھا جناب راجہ لال راجہ کی اس پیشکش کا خیر مقدم کیا ہے جس میں انھوں نے جی۔او نمبر ۱۸۱ کو واپس نہ لینے پر بھوک ہڑتال کا اعلان کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کی تمام انجمنیں اور اردو داں طبقہ ان کی تقلید کرتے ہوئے اردو کو اس کا جائز مقام دلانے کی جدوجہد میں آگے آئیں گے۔ جناب اسحاق ملک نے کہا کہ اردو میں تعلیم کے حصول کے ماسوا روزگار کی ضمانت بھی ضروری ہے۔ ورنہ اردو سے ہمدردی بے معنی ہو جائے گی آخر میں انھوں نے چیف منسٹر آندھرا پردیش پی۔ وی۔ نرسمہا راؤ سے خواہش کی کہ وہ جی۔او نمبر ۱۸۱ کو واپس لینے کے لئے اپنا اثر و رسوخ استعمال کریں۔

• رہنمائے دکن

پنجاب میں اردو کے حقوق کے تحفظ کی مانگ

پٹیالہ کے ہندی، پنجابی اور اردو کے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے حالیہ عام انتخابات میں کانگریس کی بھاری اکثریت سے کامیابی پر دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تجویز منظور کی ہے۔

ادیبوں کے اس اجتماع کو اس امر کا شدید احساس ہے کہ پنجاب میں جہاں پنجابی اور ہندی کی ترقی کے لئے قابل قدر اقدامات کئے جا رہے ہیں وہاں اردو زبان کی ترقی و بقا کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ جبکہ ہمارے دونوں ہمسائے صوبوں ہریانہ اور ہماچل میں اس زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ مزید برآں ہمارے پڑوسی ملک پاکستان کی سرکاری زبان ہونے کے ناطے سیاسی اعتبار سے بھی اردو حکومت پنجاب کی توجہ ارزانی کی مستحق ہے

(۱) یہ اجتماع متفقہ طور پر حکومت پنجاب سے اپیل کرتا ہے کہ پنجابی صوبہ بننے سے پہلے جو مراعات اردو زبان کو اس صوبے میں حاصل تھیں انھیں از سر نو بحال کیا جائے مثلاً محکمہ السنہ میں اردو زبان کا ایک شعبہ قائم ہو۔ اردو کی کتب پر حسب سابق انعامات دیئے جایا کریں اور اردو کے مصنفین کو بھی اسی طرح اعزازات سے نوازا جائے۔

(۲) پنجابی یونیورسٹی میں فارسی اور اردو کے شعبے موجود ہیں لیکن اسکولوں کی سطح پر اردو کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہونے کے سبب اردو کے طلبہ کا فقدان ہے۔ اس مضحکہ خیز صورت حال کا ازالہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اسکولوں میں اردو کو ایک اختیاری مضمون کے طور پر پڑھانے کی سہولیات مہیا کی جائیں۔

(۳) محکمہ اطلاعات عامہ کی طرف سے ترقیاتی پروگراموں سے روشناس کرانے کے لئے جو ماہنامہ "پاسبان" پہلے نکلتا تھا اسے پھر سے جاری کیا جائے تاکہ اردو کے شاعر اور ادیب بھی اس صوبے کے ترقیاتی کاموں کی ترویج و اشاعت میں اپنے طور پر خاطر خواہ معاونت کر سکیں اور اردو داں طبقہ جس کی اکثریت پنجاب میں شائع ہونے والے اردو اخبارات کی اشاعت اور مقبولیت سے ثابت ہے۔ بھی حکومت کے پروگراموں سے پوری طرح آگاہی حاصل کر سکے۔ نیز اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے جامع اور صحت مند پالیسی اختیار کی جائے۔ تاکہ لسانیات کے لالہ زار میں یہ سدا بہار پودا بھی اپنے رنگ و بو کی بدولت زینت دیدہ و دل بنا رہے۔

• نو بہار صابر

ہماری زبان

سے خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور تحریر کریں

شاعری یا شعر کا ذوق رکھتے ہیں تو شاعری سے اتنے بدگمان ہو سکتے ہیں کہ پھر کبھی ان کی طبیعت شعر کی طرف راغب نہیں ہو سکتی۔ اگر دوسری زبان والے جو اردو شاعری سے صرف مشاعروں کے ذریعے متعارف ہوتے ہیں، یہ سمجھیں کہ اردو شاعری آج بیسویں صدی کے ساتویں دہے میں بھی گل و بلبل، طور و تجلی، برق و آشیاں، صیاد و گل چیں، رقیب و ناصح، لیلیٰ و مجنوں، ہجر و وصال، معاملہ بندی، چوما چاٹی اور ابتذال کے روایتی مضامین میں گرفتار ہے تو وہ حق بجانب ہوں گے۔ ہمارے مشاعرے ہماری شاعری کی یہی تصویر پیش کرتے ہیں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اچھی شاعری کے چند نمونے نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ خوش فہمی کہ اردو مشاعرے آج بھی دوسری زبانوں سے زیادہ اپیل رکھتے ہیں، سطحیت اور بازاریت، خوش گلوئی اور محض فرسودہ شاعری کا نعم البدل ماننے کی بنا پر ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ آج چند ایسے شاعروں کو چھوڑ کر جن کا کلام لوگ صرف ان کے نام کی شہرت دعوت کی وجہ سے سن لیتے اور سطحی سے پسندیدگی کا سطحی اظہار بھی کر دیتے ہیں کوئی اچھا شاعر مشاعروں میں جانے کے لئے خوشی سے تیار نہیں ہوتا۔ مشاعرے کی کامیابی کے لئے شاعری کے علاوہ کچھ اور خصوصیات (مثلاً نظم سے تعلق، ترنم، کوئی بڑا عہدہ یا سامعین کو ہنسانے اور خوش کرنے کی صلاحیت) درکار ہوتی ہیں۔ ایسے شاعروں سے بھی لوگ نئی چیز سننے کے بجائے بار بار کی سنی ہوئی چیزیں سننے ہی پر اصرار کرتے ہیں۔ گویا مشاعرہ تخلیق کے سرچشمہ جاری کا اظہار نہیں "فرمائشی نغموں کا پروگرام" ہوتا ہے اگر کوئی اچھا شاعر محض ضابطہ کے لئے شرکت کرتا بھی ہے اور اسے داد بٹورنے کا شوق بھی ہو تو اسے اپنی سطح سے بہت نیچے اترنا پڑتا ہے۔ مشاعروں کی داد کے شوق نے اچھے اچھوں کی شاعری کو تباہ کیا ہے۔

میں نے دہلی، حیدرآباد، علی گڑھ، بمبئی، بھوپال اور کئی شہروں میں، جو اردو کے مرکز سمجھے جاتے ہیں، پچھلے چند برسوں میں جس تیزی سے بدمذاقی کو فروغ پاتے دیکھا ہے، اس کی ذمہ داری ہم سب پر عاید ہوتی ہے۔ چند برس قبل تک حیدرآباد میں نظم کی سنجیدہ شاعری مترنم روایتی غزلوں سے کہیں زیادہ پسند کی جاتی تھی، لیکن جب سے مشاعروں کو تجارتی شکل دی گئی، عوام کی پسند کے نام پر دانستہ اچھے شاعروں پر سطحی اپیل رکھنے والوں کو ترجیح دی گئی۔ عوام کا ذوق بنایا جاتا ہے، اچھی شاعری اور اچھے مشاعروں کے ذریعے۔ لیکن جب خود اردو کے ارباب حل و عقد بدذوقی کو عوامی پسند فرض کریں تو اصلاح کی گنجائش نہیں رہتی۔ فلمی گلوکاروں کی طرح اب شاعروں کی بھی مارکٹ اُن کی آواز سے متعین ہونے لگی ہے۔ ایک اور بدعت مزاحیہ مشاعروں کی چلی ہے۔ ہماری شاعری میں مزاح کا معیار کچھ ایسا نہیں جس سے لطف اٹھایا جا سکے۔ لیکن ایسے مشاعرے ادبی اعتبار رکھنے والے شعرا کے اجتماعات سے کہیں زیادہ کامیاب رہتے ہیں۔ دراصل اب ہم مشاعرے کو سستی تفریح کا وسیلہ سمجھنے لگے ہیں۔ میں نے بڑے بڑے تعلیم یافتہ اور ثقہ حضرات کو مسخروں اور سستی قوالیوں کے پروگرام میں بڑے خضوع و خشوع سے گوش بر آواز دیکھا ہے۔ ان کی تقلید اگر نوجوان اور طلبہ اور کم تعلیم یافتہ کرتے ہیں تو حیرت کی بات نہیں۔ لیکن یہی تمام حضرات و خواتین مشاعرے میں صرف ہنسنے ہنسانے، بے معنی آوازیں نکالنے اور لطف لینے کے لئے آتے ہیں۔ جہاں غیر سنجیدہ ہونا چاہئے، وہاں سنجیدگی اوڑھی جاتی ہے اور لوگ ایک اچھا فقرہ بھی برداشت نہیں کرتے، لیکن شاعری جو اعلیٰ درجے کی سنجیدگی چاہتی ہے، غیر سنجیدہ رویّوں کا اظہار بھی جانے لگی ہے۔ یہ اردو تہذیب کے انحطاط کا سب سے عبرت ناک اشاریہ ہے۔ ایسی فضا میں یہ توقع کرنا کہ مشاعروں سے شعر و ادب کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے، شعر و ادب کے زمانے کس تصور کو ماننے کا نتیجہ ہے۔ یہ بھی قابل لحاظ بات ہے کہ جو شہر اردو تہذیب کے مرکز نہیں رہے، وہاں آج تک اچھی شاعری بھی بڑی شاعری کے ساتھ سنجیدگی سے سن لی جاتی ہے۔ ادبی لحاظ سے کامیاب ترین مشاعرے آج شاید صرف سری نگر میں ہوتے ہیں، دہلی یا حیدرآباد یا لکھنؤ یا علی گڑھ میں نہیں ہوتے۔ مشاعروں کو اگر تفریح کا دلچسپ پروگرام مان لیا جائے تو میں ہنسنے ہنسانے کے لئے ان کی افادیت کو شاید تسلیم کروں۔ لیکن اردو کے کچھ محترم و معظم شیدائی مشاعروں کو شاعروں کی عظمت کا بھی معیار سمجھتے ہیں۔ اور اردو کے خادم جید علما تک مشاعرے کے مقبول شعرا کے آگے ادب سے دوزانو بلکہ کبھی کبھی سجدہ ریز نظر آتے ہیں۔ جو غیر اردو داں حضرات اردو کی سرپرستی فرماتے ہیں، وہ بھی ایسے ہی شعرا کو نواز کر اپنے نزدیک اردو کو اس کا حق عطا فرما دیتے ہیں۔ جمہوریت کے اس دور میں مشاعرے کا جمہوری کارنامہ یہ ہے کہ اس نے برے بھلے کا امتیاز ہی اٹھا دیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک خبر بلا تبصرہ آپ کو سنا دوں۔

حال ہی میں یو۔پی کی دو جامعات کی کورٹ کے لئے دو شعرا کو نامزد کیا گیا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں فراق نامزد کئے گئے ہیں اور گورکھپور یونیورسٹی میں حضرت بے کل اتساہی۔ ہم تو ہر حال میں اپنی غریب اور بے آبرو زبان پر ہر قسم کی نوازش کا شکر ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ اردو کا اب یہ حال ہو گیا ہے کہ

زخم بھی کوئی گر دیدے تو بڑا احسان ہے

اردو کو مشاعروں کے نام پر ہم نے خود تہذیبی زوال اور ذہنی انحطاط کی اس حد تک پہنچا دیا ہے کہ اردو کا مذاق اڑانے کے لئے اس زبان کے بدترین مخالفین بھی اس سے زیادہ کارگر حربہ استعمال نہیں کر سکتے۔

ہماری زبان

کو مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ خیال رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔ (ادارہ)

وحید اختر

میرا صفحہ

(۳)

ادبی مذاکروں کی افادیت و اہمیت آج بھی برقرار ہے۔ ترقی پسند تحریک نے پہلی بار مختلف زبانوں کے لکھنے والوں اور دانشوروں کو مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کرکے انھیں ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع فراہم کیا۔ آزادی کے بعد سرکاری اور غیر سرکاری، قومی اور بین قومی سطحوں پر یہ سلسلہ اور بھی وسیع ہو گیا۔ اردو کی حد تک مختلف جامعات کے اردو شعبوں نے ادبی مذاکروں کی ایک نئی روایت کی بنیاد ڈال دی ہے۔ اس معاملے میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کو خصوصیت حاصل ہے جس کا شعبۂ اردو، ہر سال کسی ادبی مسئلے پر جس کے علمی اور فکری مضمرات بھی معنی خیز ہوتے ہیں، ایک یا دو سیمینار ضرور منعقد کرتا ہے۔ کچھ اور یونی ورسٹیوں میں بھی اس طرح کے مذاکروں کا رواج ہو چلا ہے، مگر محدود پیمانے پر بعض ادبی ادارے اور تہذیبی تنظیمیں بھی ادبی مذاکرات کا اہتمام کرتی ہیں۔ اگر ان مذاکرات میں شخصی حملوں اور تعصبات و تحفظات کی لے دبی رہے تو مفید بحثیں ہوتی ہیں۔ ادیبوں کے لئے ایسے مذاکرات، کانفرنسیں اور سیمینار ضروری ہیں۔ ان سے ذہن میں بہت سے مسائل صاف ہوتے اور بحث مباحثے سے بہت سے تاریک گوشے روشن ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے ذہنوں کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر یہ مذاکرے کامیاب ہوں اور ان کی سطح علمی اور بلند رہے تو ان سے سوچنے اور لکھنے کی تحریک بھی ملتی ہے۔

مذاکرات کے برخلاف اردو کے مشاعروں کا معیار آزادی کے بعد گرا ہے، اور روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ آج صرف مخصوص اور محدود پیمانے کی شعری نشستیں ہی ادبی اعتبار سے کامیاب ہوتی ہیں۔ مشاعرے ذوقِ ادب و شعر فہمی کے وہ مقتل ہیں جہاں شاعری کا نام لے کر ناشاعری اور ذوقِ ادب کے نام پر بد ذوقی حکومت کرتی ہے اور شاعری کا خون ہوتا ہے۔ نہ صرف اچھے شاعر بلکہ خوش ذوق ادب فہم بھی اس گنجِ شہیداں سے دور رہنے ہی میں اپنی اور شاعری دونوں کی عافیت دیکھتے ہیں۔ مشاعرہ، جو ہمارا ایک زندہ تہذیبی ادارہ اور اردو کی مقبولیت کا وسیلہ رہا ہے، تہذیب کشی اور اردو کی بدخدمتی کا بہانہ کس طرح بنا، اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ ایک تو آزادی کے بعد اردو تہذیب کسمپرسی کے ہاتھوں اپنے وطن میں بے وطن سی ہو گئی۔ دوسرے اردو زبان کی تعلیم کے برائے نام انتظام یا اس کے عدم انتظام نے نئی نسلوں کو اردو ادب اور اس کی نزاکتوں سے بے بہرہ کر دیا۔ تیسرے مشاعرہ آہستہ آہستہ ایک تجارتی ادارہ بن گیا، جس کا مقصد یا تو حصولِ زر قرار پایا یا حکام و وزرا کی خوشنودی کا حصول۔ اس ذہنیت نے بھی مشاعرے کے ادبی اعتبار کو نقصان پہنچایا۔ آج سامعین اور منتظمین کی بڑی تعداد ادب سے زیادہ غیر ادبی مصلحتوں یا تقاضوں کے تحت مشاعرے میں جمع ہوتی ہے۔ اب مشاعروں کو چلانے کے لئے "میر مشاعرہ" (اس اصطلاح کے صحیح محلِ استعمال میں بھی مجھے شک ہے) کی بدعت عام ہو گئی ہے۔ کامیاب اناؤنسر (یا میر مشاعرہ؟) وہ سمجھا جاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ پھکڑپن کا مظاہرہ کرکے سامعین کو ہنسائے اور سامعین کو ہر طرح خوش کرنے والے شاعروں (یا ناشاعروں) کی گڑی بنائے یا اپنا رنگ ادب و شعر کا خون کرکے جمائے۔ اکثر ایسے حضرات شاعری سے نابلد اور شعرا کے ادبی مرتبے سے لاعلم ہوتے ہیں۔ مشاعرے کی قسمت ایسے ہی معمولی ادب کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔ یہ بدعت ثبوت ہے اس بات کا کہ اب منتظم اور سامع اناؤنسر اور خود شعرا شاعری کو تفریح کا سب سے سستا اور سہل الحصول ذریعہ سمجھتے ہیں۔ عموماً بڑے آل انڈیا مشاعروں کی مسندِ صدارت پر کوئی وزیر یا گورنر یا اسی قماش کا کوئی نام نہاد بڑا آدمی متمکن ہوتا ہے، جس کا عموماً شعر سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ شخص اردو کے حق میں کچھ امید افزا کلمات کہہ کر اور اپنے زعمِ ناقص میں شعرا کو ادب کے کچھ سبق پڑھا کر اردو اور اردو شاعری پر احسان فرماتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ ایسی بے معنی اور اکثر ٹوٹی پھوٹی بولی میں ہونے والی تقریروں پر شعرا، جو دوسرے شاعروں کے پڑھتے وقت اپنے بھی کاموں یا باتوں میں مصروف رہتے ہیں، ہمہ تن گوش ہو کر ایسی بے جا داد دیتے ہیں کہ چھتیں اڑ جاتی ہیں۔ اس طرح شعرا تو خود کو رسوا کرتے ہی ہیں، اردو زبان و ادب بھی سرِ محفل بے آبرو ہوتی ہے، جس کا کسی کو غم نہیں ہوتا۔

کچھ ادب دوستوں کی طرح اب مجھے بھی یہ احساس ہونے لگا ہے کہ اردو کے مشاعرے اب اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔ دہلی میں ہر سال دوسرے بڑے شہروں کی طرح مشاعرے کے نام پر جو دو تین کل ہند پیمانے کے تماشے ہوتے ہیں، ان سے اردو شاعری کا اعتبار بڑھتا تو بڑی بات ہے، اردو کی رہی سہی آبرو بھی سرِ عام لٹتی ہے۔ ایسے ذوق کش ہنگامے اردو کے ہر ادبی مرکز میں ہر سال برپا کیے جاتے ہیں۔ حیدرآباد یا علی گڑھ کوئی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مسلم یونی ورسٹی بھی جسے اردو تہذیب کی بہترین روایات کا آئینہ دار ہونا چاہیے، اپنے مشاعروں پر فخر تو کسی طرح نہیں کر سکتی۔ ہر جگہ اب شعری ذوق کی تسکین اور سننے سنانے کے لئے مخصوص شعری نشستیں ہی رہ گئی ہیں، جنھیں ہماری واماندگیِ شوق تراشنے پر مجبور ہے۔ عام مشاعروں میں شرکت کرکے انھیں بھگتنا تو بد ذوقی کے لئے بھی بڑا دل گردہ چاہتا ہے۔ ریڈیو پر بھی ان کا جو انتخاب آتا ہے، اسے سننے کے بعد اگر آپ داخلی

(باقی صفحہ ۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند (علی گڑھ) پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا